⊙ نازش صفدر

اسکالر، شعبۂ اُردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی

⊙⊙ ڈاکٹر فرحت جبیں ورک

صدر شعبۂ اُردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی

بیگم اختر ریاض الدین کے سفرناموں میں ماحولیاتی تانیثی شعور کا تنقیدی جائزہ

Abstract:

The 20th century was the century of women rights through feminism movement to raise the voice against patriarchy and for the equal rights of men and women. On the other hand, a movement also against environmental degradation knew as environmental movement. These two movements lead to the creation of eco feminism movement.Begum Akhtar Riazuddin enlightens eco feminism awareness in both of her travel literatures. During travel she discovers those elements that degrade the environment and also observes the environmental economics and finance. Begum Akhtar Riazuddin provides feminism consciousness and raises the voice for the women rights. Begum Akhtar Riazuddin observes those elements that are destroying the nature. According to her whatever the technology and development it always contributes in destruction of nature. This study is that of Begum Akhtar Riazuddin's travel literatures that reflect the environmental motherhood. This term is new in Urdu literature but woman gets this sense from heritage and Begum Akhtar Riazuddin uses this sense in her travelogue.

Keywords:

Begum Akhtar Riazuddin، Feminism, Travelogue, Environmental

بیسویں صدی نظریات اور تحریک کے لیے زرخیز ثابت ہوئی۔ اس دور میں فرائیڈ کے نفسیاتی تجربوں کا رل

مارکس کی مادی جدلیات اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کو فروغ حاصل ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ دور ایسے نظریات کے لیے بھی زرخیز ثابت ہوا۔ جو صدیوں سے نمو پذیری کے لیے کوشاں تھے۔اس میں ایک تانیثیت کی تحریک ہے یوں تو لفظ تانیثیت ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔لیکن یہ نظریہ یا خیال دو سو سال پہلے فیثا غورث نے سب سے پہلے اٹھایا تھا۔

اس سے متعلق انور سدید لکھتے ہیں:

''عورت کو مرد کے مساوی حقوق دینے کی موثر آواز بیسویں صدی میں بھی ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔لیکن ماضی بعید میں جھانکیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون سے بھی دو سو برس قبل جس دانشور نے عورت کی ذہنی صلاحیتوں کو پہچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام کئے وہ فیثا غورث ہیں۔مخلوط تعلیم کو ہماری آنکھوں کے سامنے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔تاہم فیثا غورث نے اپنے عہد میں بھی نوجوان لڑکیوں کو اپنے درس میں شامل ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔''(۱)

تانیثیت بطور رجحان نظریہ تو ہر دور میں زندہ رہا۔لیکن بطور تحریک یہ بیسویں صدی میں زور پکڑتا چلا گیا۔ درحقیقت تانیثیت نسائی شعور کا اجاگر ہونا ہے۔ یہ عورت کو احساس دلاتا ہے کہ وہ معاشرے میں بطور انسان اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔نسائی تحریک کئی پیچیدہ پہلوؤں کی حامل ہے۔ پدرشاہی نظام اور عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم اور تشدد کے خلاف سیاسی اور معاشی دونوں میدانوں میں خواتین کا دفاع کرتی ہے۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جب تانیثیت امن اور ماحول کی تحریک عروج پر تھیں۔اسی دور میں تانیثیت اور ماحولیاتی تحریک کے ملاپ سے ایک نئی تحریک ماحولیاتی تانیثیت نے جنم لیا۔عورت مٹی اور فطرت تخلیق کی مثلث ہیں۔ اسی لیے ان کے لیے ماں کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔عورت کو بطور تخلیق کار ماں یا مادر کا نام دیا جاتا ہے۔اسی طرح عصر حاضر میں ماحولیات کے لیے نرم جذبات رکھنے والی خاتون کے جذبے کو عظمت کی بناء پر ماحولیاتی مادریت کا نام ذہنوں میں ابھرتا ہے۔ یہ بطور اصطلاح اردو ادب میں تین طرح سے رائج ہے۔ ماحولیاتی نسائیت، ماحولیاتی تانیثیت اور ماحولیاتی مادریت۔

ماحولیاتی تانیثیت کا استعمال بطور اصطلاح تین دہائیوں پہلے ہوا یہ دو اہم تحریکوں کا امتزاج ہے۔ یہ تحریک ماحولیات اور تانیثیت کو معاشرے میں مقام مہیا کرتی ہے۔ جو لوگ فطرت اور عورت کا مقام ومرتبہ اور ترقی اور بہتری کی تائید و تقلید سے خائف ہوتے ہیں۔ یہ تحریک ان کی سوچ کی اصلاح کے لئے ہے۔

ماحولیاتی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسان کی زندگی میں ماحول کی اہمیت کا احاطہ کیا جائے۔ ماحولیات قدرتی ماحولیاتی نظام کی حیاتیاتی سائنس سے ماخوذ ہے۔ یہ نظام جاندار اور بے جان سے مل کر بنا ہے۔ جانداروں میں پودے اور ذی روح شامل ہیں۔ جبکہ بیجان اجزاء، درجہ حرارت ہوا، پانی، مٹی اور روشنی ہیں۔ اللہ تعالی نے زمین کو مٹی ہوا اور پانی جیسی نعمتوں سے نوازا ہے اور نباتات اور حیوانات سے اسے آراستہ کیا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو ماحولیاتی نظام کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ زندگی کی بھرپور علامت اور بنیادی ضرورتیں اگر آلودہ ہو جائیں تو یہی انسانی حیات کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔ ماحولیات کی ایک شاخ ایکولوجی ہے۔جس میں حیوانات اور نباتات کیموجودہ حالات سے بحث کی جاتی ہے اور ماحولیات

کی پرداخت کے ضمن میں نسائی شعور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر زیادہ ہمدرد اور کارفرما ثابت ہوا ہے۔ یہ دو الگ الگ تحاریک کی کارفرمائی ہے۔ جو مشابہ سوچ کی بناء پر ایک مشترکہ تحریک کو جنم دینے کا باعث بنی ہیں۔

ماحولیاتی تانیثیت حقوق نسواں کی مختلف شاخوں (تحریک امن، ماحولیاتی تحریکات اور جانوروں کی آزادی) سے نکل کر ایک تناور شجر سایہ دار کے مصداق نکھر کر سامنے آئی ہے۔

"According to oxford advance learner's dictionary" (2010)

"Eco feminism is defined as a philosophical and political theory and movement which combine ecological concerns with feminist ones, regarding both as resulting from male domination of society."**(2)**

"According to Webster's new world encyclopedia"(2013)

"Eco feminism is a movement as theory that applies feminist principles and ideas to ecological issues"**(3)**

دنیا بھر میں ماحول اور ماحولیاتی آلودگی اور خصوصا بدلتے ماحول ایک اہم موضوع گفتگو رہا ہے۔ موسمی تغیرات سے ہر ذی روح کسی نہ کسی طرح اس تبدیلی سے اثر انداز ہوا ہے۔ اس میں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انسان ہی اپنی ازلی خود پسندی کی وجہ سے اس کا سبب ہے۔ کائنات میں موجود جراثیم سے لے کر چاند، ستارے، سورج، زمین، جنگلات، پہاڑ، حیاتیات، نباتات سب انسان کے فائدے اور خدمت کے لئے موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

''اس کے بعد اس نے زمین کو زندگی کے لئے آمادہ کر دیا۔ اس میں سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو گاڑ دیا۔ یہ سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لئے سرمایہ حیات ہے۔''**(۴)**

انیسویں صدی تک ماحول اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ لیکن انسان کی وضع کردہ تبدیلیوں کے باعث اس میں بگاڑ پیدا ہوتا گیا۔ جوں جوں انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی انسان کے راحت اور آرام کا سبب بنتی چلی گئی توں توں ماحولیاتی نظام بگڑتا گیا۔ موجودہ صدی سے پہلے سائنسدانوں نے ماحولیاتی آلودگی کے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن ازل سے سست انسان کی سستی آڑے آ گئی اور وہ ان مسائل کا سدباب نہ کر سکا۔ ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ اڑھائی سو برس میں ہونے والی انسانی سرگرمیوں نے ہماری زمین کے درجہ حرارت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے:

کچھ کمایا نہیں بازارِ خبر میں رہ کر
بند دکان کریں بنجری پیشہ کریں **(۵)**

اس تحریک کے شروع ہونے میں پنسلوانیا کے تھری مل جزیرے پر ایٹمی ری ایکٹر کے اردگرد کے حفاظتی خول کے پگھلاؤ کا واقعہ ہے۔ جہاں ایٹمی بجلی گھر سے بڑے پیمانے پر ریڈی ایشن خارج ہوئیں۔ اس واقعہ کے بعد امریکہ میں خواتین نے

بڑی تعداد میں پہلی ماحولیاتی کانفرنس میں شرکت کی۔اس کانفرنس کا عنوان ۸۰ء کی دہائی میں خواتین اور زمین پر زندگی تھا۔ینسٹرا کنگ جو ماہرِ نسواں ہیں۔اس کانفرنس کی منتظمین میں شامل تھیں۔وہ لکھتی ہیں:

''ماحولیاتی تانیثی نظریے اور عملی اطلاق کی یکسوئی کا نام ہے۔یہ تحریک تمام جانداروں کی سالمیت کی علمبردار ہے۔ ہمارے نزدیک زمین اور پانی کا ہر طرح جاندار خواہ وہ زمینی حیاتیات ہو یا آبی حیاتیات سب ہماری طرح سماج اور معاشرے میں برابر حیثیت رکھتے ہیں۔یہ ہم عورتوں کی نمائندہ تحریک ہے۔اس خراب وقت میں ہمارے ذمہ ایک اہم کام ہے۔ہم صنعتی کارپوریشن کی یلغار،فن اور اس کے وجود کی تباہی اور فوجی جنگوں سے ایٹمی تباہی اور ماحول سے متعلق نسائی مایوسی کے خدشات کو دیکھتے ہیں۔یہ وہ ہی مردانہ ذہنیت ہے۔جو ہمارے جسموں اور جنسی استحکام سے متعلق ہمارے حق سے انکاری ہے اور جو متعدد تسلط اور غلبے کے نظام اور ریاستی طاقت پر مخصر ہے۔''(٦)

اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری بانکی مون نے مارچ ۲۰۱۰ء میں ارتھ انسٹیٹیوٹ،کولمبیا یونیورسٹی،نیویارک میں شرکاء سے ایک اجلاس سے خطاب میں بتایا کہ دنیا کی ترقی میں خواتین کا اہم کردار ہے۔یہ امن اور اس کی حفاظت میں اہم کردار رکھتی ہیں۔خواتین دنیا کے بیشتر حصوں میں خاندانوں کے لیے چیف وسائل مینیجر کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی لیے ماحولیاتی آلودگی سے تحفظ میں ان کی شمولیت بہت ضروری ہے۔ہم اکثر غذائیت،ایندھن اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے قدرتی وسائل پر انحصار کرتے ہیں اور ان سب ضروریات کے حصول کی تکمیل کے لیے خواتین ماحولیاتی تبدیلیوں اور خطرات کا شکار زیادہ ہوتی ہیں۔خواتین کے کام کا بوجھ اکثر قدرتی وسائل،حیاتیاتی تنوع اور ماحولیاتی نظم ونسق پر مرکوز ہوتا ہے۔لہٰذا اِن کے تجربات اور نقطہ ہائے نظر ماحولیات کے لیے پائیدار حکمتِ عملی اور ترقیاتی اقدامات کے لیے نہایت ضروری ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے صحت مند سیارہ موجود ہو۔ترقی پذیر دنیا کی خواتین بنیادی طور پر اپنے کنبے کے وسائل کے انتظام اور تحفظ کی ذمہ دار ہیں۔

دنیا بھر میں خواتین کو ماحول کی ترقیاتی کاوشوں میں شامل کیا جارہا ہے۔خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کے خاتمے سے متعلق ایک کنونشن ۱۹۷۹ء میں منعقد ہوا۔اس میں مختلف بل پیش ہوا ن میں ایک بل برائے حقوقِ نسواں سے متعلق ہے،اس میں ماحولیاتی مسائل کے متعلق تفصیلی خطاب کیا گیا۔اسی طرح خواتین سے متعلق چوتھی بڑی کانفرنس جنگ پلیٹ فارم فورایکشن ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوئی۔اس میں خواتین اور ماحولیات سے متعلق ایک پورا باب شامل ہے۔اس میں اس بات کو زیرِ بحث لایا گیا کہ ماحولیاتی آلودگی مردوں اور عورتوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

خواتین اور ماحولیات کے درمیان رابطہ صرف ترقی پزیر ممالک میں نہیں بلکہ یہ شرح طرح ترقی یافتہ ممالک میں بھی ہے۔۲۰۰۷ء کی سویڈش حکومت کی ایک رپورٹ کے مطابق خواتین کی اکثریت گھریلو سطح پر اور سفر کے دوران ماحولیات کی حفاظت سے متعلق زیادہ بہتر فیصلے کرسکتی ہیں۔کیٹ اوورن خواتین کی عالمی وکالت کی ایک ادارہ خواتین برائے تعمیر وترقی کی چیف ایگزیکٹوڈائریکٹر ہیں۔یہ ادارہ خواتین کے معاشرتی اور معاشی انصاف کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے اور عالمی سطح پر خواتین کی نمائندگی کرتا ہے۔اس کی کوششوں سے حال میں ہی موسمی تبدیلیوں سے متعلق

امریکی مذاکرات میں پہلی مرتبہ عورتوں کی نمائندگی حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی روسی معاشرے کے لیے بہت پرہنگم تھی۔ امریت پسند کمیونسٹ حکومت کے ختم ہونے اور آزادانہ طور پر اپنی رائے کے اظہار نے بہت سی تحریکوں اور تنظیموں کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک تحریک ایکوڈفینس تھی اس تنظیم کا مقصد ماحولیاتی مسائل کا حل تھا اس کا نعرہ تھا۔ مادرِ ارضی کے دفاع میں کوئی سمجھوتا نہیں۔ اس تنظیم کا حصہ روسی ماہرِ ماحولیات الیگزینڈر کورولیوا بھی تھیں۔ انھوں نے موحولیاتی تحفظ اور لوگوں کو ماحولیاتی آلودگی سے بچانے کے لیے انتھک محنت کی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بحیرہ بالٹک کے ساحل سمندر میں روسی فیڈ ریشن کے خطے میں قدیم ماحول کو تحفظ فراہم کرنے میں گزار دیا۔ انھوں نے قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے شہریوں کو ماحولیاتی آلودگی سے بچانے کے لیے بہترین کام کیے۔ انھوں نے اس تنظیم کے ساتھ مل کر ۱۵ سال بنا سرکاری سرپرستی کے بے شمار قابلِ ستائش کام کیے۔ اس تنظیم نے ڈائی آکسیجن جیسے نقصان دہ مادے کے ذریعے خطے کے آبی وسائل کی آلودگی کے خلاف مزاحمت کی اور غیر ملکی جوہری فضلہ کی ملک میں درامد کی مخالفت کی اس کے علاوہ ان کے کئی قابلِ ستائش کارنامے ہیں۔

بیرفورٹ سولر انجینئرز منصوبہ ہندوستان کے دیہی راجستان میں بیرفورٹ کالج بھی ایک ماحولیاتی تحفظ میں انقلاب برپا کر رہا ہے۔ یہ ایک پرسکون انقلاب ہے جو غریب ترین دیہاتیوں کو سولر توانائی اور صاف ستھری ٹیکنالوجی فراہم کرتا ہے۔ اس انقلاب کی پیش روافریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی نیم خواندہ دیہاتی خواتین ہیں۔ ان میں زیادہ تر تعداد بوڑھی عورتوں کی ہے جو ہنر مند سولر انجینئرز کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ بیرفورٹ کالج کی بنیاد ۱۹۷۲ء میں ہندوستان کے علاقے راجستھان کے ٹیلونیا گاؤں میں سماجی کارکن اور معلم نے رکھی تھی۔ ان کا مقصد صاف پانی اور قابلِ تجدید توانائی اور تعلیم مہیا کرنا ہے۔ اس کالج سے خواتین خاص طور پر بوڑھی خواتین سولر انجینئرز کی تربیت حاصل کر رہی ہیں۔

۲۰۰۵ء کے بعد سے ۹۲ ممالک کی ان دیہاتی خواتین میں سے ۲۵۰ نے ۱۰۰۰۰ گھروں کو سولر توانائی سے بجلی کی فراہمی ممکن بنائی۔ ان میں راجستھان کے گرم صحرا کے میدانی اور دیہاتی علاقے، لداخ کے سرد پہاڑی حصے افریقہ کے مالی اور سولوجا کے علاقے شامل ہیں۔ سولر توانائی کی طرف جانے سے ان علاقوں میں لکڑی، ڈیزل اور مٹی کے تیل کا استعمال کم ہو گیا۔ جس سے ماحولیاتی آلودگی اور جنگلات کے کٹاؤ میں کمی واقع ہوئی۔

فضا کو فضائی آلودگی سے بچانے کے لیے ایرنیٹیکل انجینئر ڈاکٹر سارہ قریشی بھی ماحول بچاؤ مہم کی سرگرم رکن ہیں۔ وہ فضائی آلودگی کے بارے فکرمند نظر آتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ آسمان کو فضائی آلودگی سے بچانا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ آسمان پر اس سے بچاؤ کے لیے کوئی درخت نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے ہوائی جہاز کا ایک ایسا انجن تیار کیا جو فضا میں نقصان دہ گیسوں کا اخراج کم سے کم کر کے فضائی سفر کے ذریعے پھیلنے والی آلودگی کو کم کرنے میں مدد دے گا۔

جہازوں کے انجن سے خارج ہونے والا دھواں فضائی آلودگی اور عالمی حدت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے ایک ایسا آلہ تیار کیا جو جہاز کے انجن میں بننے والے دھویں کو جہاز کے اندر ہی پراسیس کر کے اس میں سے پانی الگ کر لیتا ہے اور اکٹھا کر کے اسے لینڈنگ کے وقت بارش کی صورت میں اسے خارج کر دیتا ہے۔ بین الاقوامی

اداروں اور دنیا بھر کی خواتین کی کوششیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ ماحول سے متعلق فیصلوں میں خواتین کا عمل دخل ایسے ہی لازمی ہونا چاہیے جیسے خواتین اور فطرت کا تعلق لازم وملزم ہے۔

عورت کا فطرت کے ساتھ تعلق اس کی تخلیق کے ساتھ ہی قائم ہو گیا تھا۔ مادرسری دور میں عورت اور مرد کے درمیان ایک فرق اپنے خاندان کو غذا مہیا کرنے کا فرض بھی تھا۔ غذا کے حصول کے لئے مرد شکار پر جا سکتا تھا لیکن عورت اپنی ذمہ داریوں کی زنجیر سے بندھی تھیں مدد شکار سے جبر کی علامت بنا اور عورت غذائی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کاشتکاری کا سہارا لیا وہاں سے محفوظ کرتی اور دوبارہ اسے استعمال میں لاتی۔ یوں عورت فطرت کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ عورت کا فطرت سے لگاؤ نسل در نسل میں منتقل ہوتا چلا گیا اور آج کے معاشرے میں عورت اپنی فطرت پسندی کی خصلت کی بنا پر فطرت کے زیادہ قریب ہے اور فطرت کی خرابیوں کو زیادہ جلد محسوس کرتی ہے۔ عورت اور فطرت کے مابین تعلق کو چند بنیادی تصورات سے ثابت کیا گیا۔ دنیا ثنویت کے نظریے پر قائم ہے۔ جیسے ثقافت/ فطرت، عقل/ جذبات، مرد/عورت، زمین/جسم، انسان/ جانور۔ فطرت، جذبات، عورت، جسم اور جانوران کو متعلقہ جوڑے سے متضاد اور کمتر سمجھا جاتا ہے یعنی ثقافت، عقل، مرد، دماغ اور انسانیت تسلط اور جبر کا شکار ہیں۔ اسی طرح فطرت اور خاتون دونوں تسلط کا شکار ہیں اور اس طرح دونوں کے مابین تعلق بنتا ہے۔

مختلف ایکوفیمینسٹ کی ادبی کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ادب میں فطرت اور خواتین کی باہمی وابستگی کو بیان کرتی ہیں۔ (ایک امریکی فلاسفر اور مورخ انتہا پسند ماہرِ ماحولیات کے متعلق Carolyn Merchant کیرولن مرچنٹ) لکھتی ہیں:

> ''یہ ایک نئے تصور پر عمل پیرا ہیں کہ فطرت کا تسلط، انسانوں کے نسلی، طبقاتی اور جنسی تسلط کے جیسا ہی ہے۔'' (۷)

تسلط کی یہ فضا سترویں صدی میں پیدا ہونے والی میکانکی دنیا کے نظریے نے قائم کی جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حق میں ابھرا اور جس نے یہ نظریہ در کر دیا کہ فطرت جاندار حیات ہے اور فطرت کو مال اسباب کے طور پر استعمال کیا جانا جائز قرار دیا اور اس طرح فطرت صنعتی سرمایہ داروں کے ہدف کا ہمیشہ سے نشانہ رہی ہے۔

مرچنٹ ماحولیاتی تانیثیت کے متعلق مختلف رائے رکھتی ہیں۔ وہ ماحولیاتی اصلاح پسندوں کے خیالات کی حامی ہیں۔ اور قانون سازی اور مثبت لائحہ عمل کے ذریعے تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ وہ ثقافتی ماحولیاتی تانیثیت میں ماحولیاتی مسائل کو پدرشاہی نظام پر تنقید کے تناظر میں دیکھتی ہیں۔ سماجی ماحولیاتی تانیثیت مردوں کے عورتوں پر پدرانہ تسلط اور مردوں کی فطرت پر پدرانہ تسلط کے درمیان تعلق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کہ پدرشاہی سرمایا دارانہ نظام میں عورت اور فطرت جاندار سمجھنے کی بجائے مال واسباب سمجھا جاتا ہے۔

ایک ماحولیاتی تانیثیت مصنفہ سوسن گریفن اپنی کتاب Women and Nature: The Roaring Inside Her ماحولیاتی تانیثیت فکر بیان کرتی ہیں وہ کہتی ہیں:

> ''میں جانتی ہوں کہ میں اس زمین سے بنائی گئی ہوں۔ جیسے میری ماں بھی اسی زمین کے ہاتھوں

سے بنی ہے جیسے اس کے خواب اور سب کچھ جو میں جانتی ہوں اسی زمین سے جڑا ہوا ہے۔"(۸)

ان کے نزدیک فطرت ایک نسائی مسئلہ ہے وہ ایک پودے یا جانور اور انسانی زندگی کے رب کے بارے میں مکمل معلومات تک رسائی کی تجویز دیتی ہیں وہ کہتی ہیں۔ کہ جیسے انسان اور جانور کے درمیان تعلق ہے۔ اسی طرح عورت اور فطرت کے درمیان بھی تعلق ہے۔ وہ اس تمام ترقی سے پردہ اٹھاتی ہیں ہے جو عورت اور فطرت کو نقصان دیتی ہے وہ اسے بدنما ترقی کہتی ہیں۔ وہ سائنس کے جدید نظام کی مذمت کرتی ہیں جو اخلاقی اقدار سے آزاد ہے۔ ان کے خیال میں اس بدنما ترقی نے جنگلات کو ندیوں سے کھیتوں کو جنگلات سے اور جانوروں کو ثقافت سے الگ کر دیا ہے اس کے بدلے میں موت کو عام کر دیا ہے۔ وہ اپنے مضمون ترقی، ماحولیات اور خواتین میں ان کے تعلق کو مضبوط کرتی ہیں آج کا ترقی یافتہ دور مساوات کا مخالف ہے۔ اس نے طبقوں یا ثقافتوں اور صنفوں کی یکساں درجہ بندی کو ختم کر دیا ہے۔ جس سے عورت کا زوال اور فطرت کا تیزی سے خاتمہ ہو رہا ہے۔ گریفن فطرت اور عورت کے مابین اس تعلق میں بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں کہ اس تعلق کو تبدیل ہونا چاہیے۔ وہ چاہتی ہیں کہ پودے، جانور اور انسانی زندگی کے درمیان تعلق کے بارے پوری آگاہی ہونی چاہیے۔ اس تعلق کو صرف عورت تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی کتاب کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسے انسانوں اور جانوروں کے مابین تعلق اور ماحول کی تباہی و بربادی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کردار۔

ان کے اس نظریے پر ایک امریکی ماہرین نسواں مہر ثبت کرتی ہیں کہ خواتین کو اب یہ سمجھنا ہوگا کہ اس معاشرے میں ان کے لئے کوئی آزادی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ماحولیاتی بحران کا کوئی حل نکل سکتا ہے۔ جب تک تانیثیت اور ماحولیاتی تحریک متحد نہیں ہو جاتیں تا کہ بنیادی معاشرتی اور معاشی صورت حال کو درست کیا جا سکے تب تک کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ خواتین کے حقوق اور ماحولیاتی تحفظ کے لئے دونوں کو ایک ہونا ہوگا اسی سے آج کا معاشرہ درست راہ اختیار کرے گا۔ اس سے متعلق روز میری لکھتی ہیں:

> "خواتین کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے ایک ایسے معاشرے میں خواتین کو کوئی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی ماحول مجودہ بحران سے نکلا جا سکتا ہے۔ جہاں فطرت اور خواتین تسلط کا شکار ہوں وہاں اس عمل کے خلاف خواتین کو تانیثی اور ماحولیاتی نظریات کے لیے متحد ہونا چاہیے۔ تا کہ بنیادی معاشرتی و معاشی تعلق اور اس معاشرے کی نہ ختم ہونے والی اقدار کی تشکیلِ نو کی جا سکے۔"(۹)

"مرچنٹ" کی کتاب The Death of Nature: Women Ecology and Scientific Revolution ماحولیاتی تانیثی فکر میں خاص مقام رکھتی ہے۔ مرچنٹ کے نزدیک سائنس اور ٹیکنالوجی نے پیدا ہونے والے ماحول نے فطرت کو ایک مشین کے طور پر پیش کیا ہے عقل کو جذبات سے الگ کر دیا۔ مردوں کو عورتوں سے اور جانور اور فطرت کو الگ کر دیا(۱۰):

> "میں اس تمام ترقی سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ جو عورت Staying Alive کے لیے نقصان دہ ہے۔ شیوا جدید سائنس کے اس تصور کی مذمت کرتی ہیں۔ جو اخلاقی اقدار سے آزاد ہے اور علم تکثیری اظہار کو روکتا ہے۔ ان کے نزدیک بدنما ترقی نے جنگلات کو ندیوں سے، کھیتوں کو جنگلات

سے اور جانوروں کو ثقافت سے الگ کر دیا ہے اس کے نتیجے میں موت عام ہوگئی ہے۔"(۱۱)

کیرن وارن نے اپنی کتاب Feminism and Ecology Making Connection میں فطرت اور عورت کے مابین تعلق کی نشاندہی کی۔انہوں نے ماحولیاتی تانیثیت کو ایک فلسفیانہ نقطہ نظر اخلاقی رجحان اور سیاسی تحریک کے طور پر بیان کیا۔ وہ عورت اور ماحول کے مابین تعلق پر چند سوال اٹھاتی ہیں پھر ان کے جواب تلاش کرتی ہیں۔ ماحول کو کیا چیز تانیثی مسئلہ بناتی ہے؟ خواتین کے تسلط اور فطرت کے تسلط کے درمیان کون سے ممکنہ روابط ہیں؟ ان روابط کی پہچان کیسے اور کیوں اہم ہے؟ وہ اپنی کتاب میں ان تمام عوامل کی نشاندہی کرتی ہیں جس سے عورت اور فطرت کے مابین تعلق کی وضاحت ہوتی ہے۔

خاتون مشرق سے تعلق رکھتی ہو یا مغرب سے ماحولیاتی شعور دونوں میں یکساں بنیادوں پر پایا جاتا ہے البتہ ان کا طریقہ اظہار مختلف ہے پاکستان میں خواتین لکھاری اپنے ماحولیاتی شعور کا اظہار ادب کے ذریعے کرتی ہے ان میں بیگم اختر ریاض الدین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ بطور سیاح مختلف ممالک کا سفر کرتی ہیں اور وہاں کے ماحول میں بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر کا تجزیہ کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف افسانہ نگاروں نے فطرت کو مسخ کرنے والے عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی ترقی اسے کیسے ہولناکی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ان میں فہمیدہ ریاض، ذکیہ مشہدی، سلمیٰ جیلانی، عذرا نقوی، نسیم سید، ناہید اختر اور ثروت خان کی ماحولیاتی ادبی کاوشیں قابل ذکر ہیں۔

فہمیدہ ریاض اپنے افسانے 'شیشے کے اس پار' میں نسائی حساسیت اور ماحول اور فطرت سے لگاؤ کو سلطانہ کے کردار کے ذریعے واضح کرتی ہیں۔

اسی طرح سبین علی کا افسانہ 'کتن والی' ماحولیاتی مادریت کے تفکر اور فلسفے کی وضاحت کرتا ہے۔ان کے افسانے ماحول کی تبدیلی سے خواتین پر اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔اور کیسے بڑی صنعتیں چھوٹی صنعتوں کو ختم کر رہی ہیں۔اس سے متعلق پروفیسر فرخ ندیم لکھتے ہیں:

> ''جب افسانے کا نام کتن والی رکھ لیا تو افسانہ نگار نے کہانی کے مرکز میں کتن والی رکھی۔ مائی جولاہی سوتھل کھیس چادریں کات کر سماج کو موسموں سے بچاتی رہی۔مگر سماج اس کو نہ سمجھ سکا نہ کوئی گھر دے سکا یہ المیہ ہے اہل ہنر کا، بنیادی مسئلہ افسانہ نگار نے واضح طور پر متعین کی صورت سامنے رکھ دیا کہ سرمایہ دار کس طرح ہاؤسنگ سکیموں کی صورت کچھ شہروں کے مرکز میں بیٹھا جا رہا ہے اور غریب کا ہنر مار جنز کے چلے جاتے ہیں، طاقت اپنا مقام طاقت سے حاصل کر لیتی ہے اور طاقت کو کسی شاعر ادیب اہل ہنر استاد کے جذبات کا احساس نہیں ہوتا۔طاقت تو بس مفاد تقسیم کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے طاقتور کو ہر طرح سے سہولیات فراہم کی ہے۔آج ایک شخص ریاست کے اندر اپنی ریاستیں بنا تا جا رہا ہے اور حکومت اس کو سہولت فراہم کرتی جا رہی ہے۔آج صورتحال یہ ہے کہ مارگلہ کی پہاڑیاں آہستہ آہستہ بلڈوزر ہونا شروع ہوگئی ہیں اشرفیہ ان میں

ولاج بنائے گی اور پورا ملک تفریح سے محروم ہو جائے گا یہاں تک فطری حسن کا نام ونشان مٹ جائیگا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طاقت پھیلتی جاتی ہے اور کم روز سکڑ تیجاتے ہیں ایسے ہی جیسے مائی جولا ہی کی زندگی بسر سکڑتی ہے اور آخر میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں غربت نہیں غریب ختم کیا جا رہا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس سنجیدہ افسانہ نگار اپنی معاشرت کا شعور رکھتا ہے اور اپنی کہانی میں وہ پراسیس دکھاتا ہے۔ جس سے انسانی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ یہی عمل اس افسانے کا حسن ہے مائی جولا ہی افسانے کا ہی نہیں اس معاشرت کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ افسانہ نگار نے اس مہارت سے اسے بنا ہے کہ قاری کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے افسانے کا عنوان علامتی۔ بیانیہ مضبوط۔ تہہ دار اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاندار افسانہ فکری طور پر ترقی پسند۔ طبقاتی کشمکش مزدوروں کی محنت اور مسائل کو متن کرتا پسماندگی کی حقیقی تصویر بنتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبصورتی محنت کی جمالیات ہے مائی جولا ہی کا کردار اس کا سراپا اس کی مصروفیات اس کی محنت سے لگن، اس کے ہنر سے لگن، ثقافت سے جڑت یہ سب مارکسی جمالیات کا اہم باب ہے۔ مائی جولا ہی ایک ثقافت کی علامت بھی ہے جو دن بدن اربنائزیشن کا شکار ہوتی سکڑتی جا رہی ہے۔ لیکن مشینوں کی یلغار کے سامنے یہ ثقافت بے بس ہے اور ایک دن معدوم ہو جاتی ہے افسانہ نگار کمال ہنر سے اس ثقافت اور رونق کو زوال پذیر ہوتے دکھایا ایسا لگتا ہے جیسے مارکس کے اس باب کی تمثیل لکھ دی مارکس اور مارکسیوں کا خیال ہے کہ طاقتور کمزور کو اس کے کلچر سمیت تباہ کرنے کی خاطر کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔ (۱۲)

ماحولیاتی تبدیلی کے احساس کو سب سے پہلے عورت نے محسوس کیا ہے۔ اسی لیے حالیہ دہائیوں میں ماحولیاتی تحریکوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں آج خواتین اپنے حقوق اور فطرت کے تحفظ کے سرگرم نظر آتی ہیں۔ عورتیں مردوں کی نسبت قدرتی وسائل کے زیادہ نزدیک ہیں۔ اسی لیے عورت ماحول میں آنے والی تبدیلیوں کو جلد محسوس بھی کرتی ہیں۔ مثلاً بچوں کو نہلاتے وقت یا پانی کی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے اسے پانی کے حصول میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ یا کھانا بناتے وقت اس کی مخصوص بو میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ یا پھر جب اس کے اہلِ خانہ کو پر اسرار بیماری آن گھیرتی ہے۔ یا پھر کھانا بناتے ہوئے ایندھن کے لیے مشکل کا شکار ہوتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں خواتین جلد ماحولیاتی تبدیلی کو محسوس کرتی ہیں۔

عورتیں قدرتی وسائل کو احترام کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اور ان کے تحفظ کو فروغ دینے کے لیے سرگرم کارکن کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں۔ اسی لیے ماحول کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر مختلف ہے اور وہ فطرت کی صلاحیتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

خواتین کی ماحولیاتی تحفظ کے لیے عوامی تحاریک ماحول کے تحفظ کی طرف راغب کرتی ہیں۔ یہ تحاریک ماحول دشمن کارروائیوں کے بعد منظر عام پر آئیں۔ جن میں خواتین جنگلات اور جانوروں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ہر قدم پر

کوشاں نظر آتی رہی ہیں۔اس ذیل کی ایک اہم تحریک چپکوتحریک ہندوستان کی ریاست اتراکھنڈ کے ضلع چمولی کے ایک گاؤں سے اٹھی۔ یہ ماحولیات کی پہلی تحریک تھی جو خواتین کے ماحولیاتی تحفظ کے عزم کی داستان رقم کرتی ہے۔چپکو لفظ دراصل ہندی لفظ 'چپک' سے نکلا ہے۔اس تحریک کے پس پردہ بنیادی وجہ وہ سرکاری افسران اور ٹھیکیدار تھے۔ جو جنگلات کو مسلسل نقصان پہنچارہے تھے۔جس کی وجہ سے وہاں رہنے والے لوگوں کو سیلاب، زمینی کٹاؤ اور دیگر معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔ جنگلات کے ٹھیکیداروں نے جنگل کی کٹائی کے لئے ایسا دن مخصوص کیا جب گاؤں کے مرد سرکاری واجبات کی وصولی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ان کا خیال تھا عورتیں مزاحمت نہیں کریں گی مگر خواتین نے ٹھیکیداروں کے فیصلے کی مذمت کے طور پر درختوں کو گلے لگالیا۔

'نو دانیا' تحریک،اس تحریک کو'نو سیڈ موومنٹ' بھی کہا جاتا ہے۔اس تحریک کا مقصد'نامیاتی زراعت' کا فروغ اور کیمیائی فصلوں کا بائیکاٹ ہے۔قدرتی توازن میں بگاڑ پیدا کیے بنا زراعت کو نامیاتی زراعت کہتے ہیں۔اس طریقۂ زراعت میں کیمیائی کھاد کا استعمال نہیں کیا جاتا اور نہ ہی بیماری اور کیڑوں پر قابو پانے کے لیے زہر آلود کیمیکل کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس فلسفے کے پیچھے مستقبل کے تحفظ کا نظریہ کارفرما ہے۔اس تحریک کے محرکات ماحولیات کے تحفظ،قدرتی وسائل کے تحفظ اور ان کو تباہ کیے بنا آئندہ نسلوں کے لئے ایک پرفضا دنیا کو برقرار رکھنا ہے۔مصنوعی کیمیائی کھاد اور کیڑے مار ادویات کے استعمال سے زمین اور ماحول دونوں کو نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نامیاتی طریقہ کاریوں تو آج کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔لیکن یہ دنیا کا قدیم طریقہ زراعت ہے کیمیائی کھاد اور دیگر کیمیائی مواد دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہوا۔جس سے انسانوں اور جانوروں کی صحت کو شدید خدشات لاحق ہیں۔نو دانیا تحریک نامیاتی طریقہ زراعت کے حق میں نسائی آواز ہے۔اس تحریک کے حامیوں کی تعداد پانچ لاکھ ہندوستانیوں سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس تحریک کی بدولت ہندوستان میں مختلف مقامات پر ۳۵ بیجوں کے بنک بنائے گئے ہیں۔جس کا مقصد نامیاتی زراعت کا فروغ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ تحریک آب وہوا کی تبدیلی کھانے کا ضیاع اور ٹیکنالوجی کے غلط استعمال جیسے بین الاقوامی مسائل کو بھی اجاگر کر رہی ہے۔

کینیا کی زمین پر قبضہ کی تحریک دراصل افریقہ میں بہت سے ممالک میں صنفی تضاد کو بالائے طاق رکھ کر خواتین پر ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ڈالا گیا ہے۔خواتین کو گھر کی دیکھ بھال کے علاوہ کھیتوں میں باپ اور شوہر کے ساتھ مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ یہ اصول ان پر قبیلے کی طرف سے لاگو کیا جاتا ہے۔خواتین کی یہ طرزِ زندگی تنزانیہ، یوگنڈا اور کینیا میں نہایت عام ہے۔ یہاں بعض اوقات خواتین اور مردوں کی فصلوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔مثلاً خواتین پھلیاں،مکئی وغیرہ اگاتی ہیں جبکہ مرد'یام' کی فصل اگاتے ہیں۔خواتین کی ذمہ داری ایسی فصل کو اگانا ہے جو گھریلو استعمال میں عام ہو لیکن اگر مقدار میں بہت زیادہ ہو تو اسے بیچ بھی دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ افریقہ میں خواتین کی زراعتی آمدنی کو بڑھانے کے لئے'ایف۔اے۔او' کی طرف سے خصوصی زرعی کیٹس فراہم کی جاتی ہیں۔ان میں مٹر، باجرہ،سبزیوں اور پھلوں کے بیج ہوتے ہیں۔۔افریقی خواتین کا زراعت میں کردار کا اندازہ ۱۹۸۰ء میں سر اٹھانے والی تحریک سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تحریک بڑی بڑی کارپوریشنز کے خلاف تھی۔ یہ کارپوریشن زمین پر قبضہ کر کے حسب منشا پیداوار بڑھانا چاہتی تھی۔اس

کارپوریشن کا مقصد غیر ملکی منافع کے حصول کے لیے کافی کی کاشت کے لیے کسانوں پر دباؤ ڈالنا تھا۔ اس کے خلاف خواتین نے آواز بلند کی یہ احتجاج دو دہائیوں تک جاری رہا اور اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔

'لوکینال' تحریک نیویارک میں لوکینال کے گھروں کے مالکان کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں شروع ہوئی۔ خواتین کی طرف سے ابھرنے والی یہ تحریک ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ نیویارک میں ایک کیمیکل کمپنی نے لوکینال ٹاؤن کی جگہ پر زہریلا صنعتی مواد ضائع کیا۔ اس مواد کو ضائع کرنے کے لیے اس کیمیکل کمپنی نے ایک اشاریہ سات ملین ڈالر خرچ کیے۔ اس کے بعد یہ جگہ ایک سکول کو بیچ دی گئی۔ لیکن سکول نے بھی یہ زمین آگے بیچ دی اور آخر کار اس جگہ لوکینال ہاؤسنگ سوسائٹی بن گئی۔ لوئس گیبی جو کہ اس سوسائٹی کی رہائشی تھیں اور اس تحریک کی قائد بھی تھیں۔ انھوں نے یہ محسوس کیا اس رہائشی علاقے کے مکین بار بار مختلف بیماریوں سر درد، متلی، اموات اور پیدائش میں نقائص اور کینسر جیسے مسائل کا شکار ہو رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں یہ تحریک لوئس گیبی اور اس علاقے کی دیگر خواتین کے زیرِ سایہ ابھری تھی۔ لیکن اس میں مردوں نے بھی شانہ بشانہ ساتھ دیا۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد تھا کہ ریاست ان کو دوسری جگہ منتقل کرے اور آخر ان خواتین کی بدولت اس علاقے کو مضرِ صحت قرار دیا گیا اور اس کی صفائی کے لیے چھ اشاریہ ایک ملین ڈالر لاگت آئی۔

'گرینہم کامن' تحریک برطانیہ سے خواتین کی قیادت میں ابھرنے والی تحریک جوہری ٹیکنالوجی اور جوہری جنگ کے خلاف تھی۔ خواتین نے گرینہم کامن ایئر بیس کے اڈے پر ناکہ بندی کر دی کیونکہ ان خواتین کا خیال ہے کہ جوہری ٹیکنالوجی زمین پر تشدد اور تباہی کا سبب ہے۔ عصرِ حاضر کی خواتین نے آج ماحول بچاؤ مہم کا حصہ بننے کے لئے تعلیم اور قلم کا سہارا بھی لیا اور متحد ہو کر مختلف این جی اوز کے تحت آواز بھی بلند کی۔ ان خواتین ماہر ماحولیات میں میی نگ اہم نام ہے کہ ۱۹۹۲ء میں چین کے شہر ہانگ کانگ میں پیدا ہوئی۔ یونی ورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے سے انتھروپولوجی میں بی۔ اے کیا۔ انھوں نے چین میں ماحولیاتی شعور کو اجاگر کرنے کے لیے تگ و دو کی۔ وہ خواتین میں ماحولیاتی تحفظ کے شعور اجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے ہانگ کانگ میں فرائیڈ اوفریتھ میں بطور مینیجنگ ڈائریکٹر کام کیا۔ یہ ادارہ چین میں ماحول کے تحفظ میں سرگرم ارکان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں میی نگ کا نام ماحولیات کے تحفظ پر رول آف آنر کے لیے منتخب ۱۰۰۱ ۵ افراد میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۲ء میں ہی انھیں چین کی ماحولیاتی کونسل میں بطور مشیر مقرر کیا گیا۔ ۲۰۰۳ء میں انھیں ہانگ کانگ کی ایس اے آر حکومت کی طرف سے 'برانز باؤشی نیا' کے تمغے سے نوازا گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے قابلِ تجدید توانائی کے ادارے کی بنیاد رکھی۔

وندنا شیوہ ۵/نومبر ۱۹۵۲ء کو ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے طبعیات میں بی ایس کیا۔ یونیورسٹی آف گیلف کینیڈا سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ یونی ورسٹی آف ویسٹرن اونٹاریو سے کوانٹم تھیوری فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وندنا شیوا ایک سرگرم ماحولیاتی کارکن ہیں۔ جو ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں ماحولیاتی شعور اجاگر کرتی ہیں۔ انھوں نے مقامی سطح پر کیمیکل سے پاک زراعت کی تحریک چلائی۔ وہ اس حقیقت سے خوب آگاہ ہیں کہ کیمیکل سے حاصل کی گئی خوراک عورتوں اور بچوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ انھوں نے نو دانیا کے عنوان سے ایک تحریک شروع کی۔ جس میں انھوں نے کیمیکل سے پاک قدرتی طور پر پرورش پانے والی فصلوں کی ایک منڈی تشکیل دی اور لوگوں کو

کیمیکل کے نقصان اور ان سے پاک زراعت کے فوائد سے آگاہ کیا۔ انھیں کئی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں انھیں 'رائٹ لیوہوڈ' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں سڈنی میں 'پیس پرائز' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۰۱۱ء میں 'کیل گیرے پیس پرائز' سے نوازا گیا۔ ان کا شمار فوربس کی سات بااثر خواتین میں ہوتا ہے۔

وانگاری ماٹھائی ۱۹۴۰ء میں کینیا کے شہر ہنری میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے کیٹاس کے ماونٹ سینٹ سکول سٹیکا کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جن کو ۱۹۶۴ء میں کینیا سے امریکہ تعلیم کے حصول کے لیے لایا گیا۔ انھوں نے حیاتیات میں ڈگری حاصل کی اور ۱۹۶۶ء میں انھوں نے نیروبی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وانگاری ماحولیاتی نسائیت کے علاوہ انسانی حقوق کی حامی تھیں۔ انھوں نے ماحولیات تحفظ کے لیے گرین بیلٹ تحریک شروع کی۔ ان کی ذاتی زندگی مشکلات کا شکار رہی اور زیادہ تر عمر جیلوں میں کاٹی۔ انھیں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔ ۲۰۱۱ء میں کینسر کی وجہ سے چل بسیں۔

ماریا چیر کاسووا ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق صحافت کے شعبے سے ہے۔ اس کے علاوہ ماہرِ ماحولیات سی آئی ای پیکی ڈائریکٹر ہیں۔ (Center for independent ecological programmers) ان کا شماران خواتین میں ہے جنھوں نیدر یائے کٹون پہ 'ہائڈروالیکٹرک ڈیم' کی تعمیر کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ مہم چار سال تک چلتی رہی۔ ۱۹۶۰ء میں وہ طلبہ کی ماحولیاتی تحفظ کی تحریک کا حصہ رہیں اور ریڈ ڈیٹا بک کے شعبے ماحولیاتی تحفظ کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے معاشرتی ماحولیاتی یونین کی بنیاد رکھی۔ جو کہ سوویت یونین کی سب سے بڑی ماحولیاتی تحفظ کے لیے کام کرنے والی این جی او کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں سی آئی ای پی کی ڈائریکٹر رہیں۔ یہ ادارہ مقامی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر ماحولیاتی سرگرمیوں کو منظم کرتا ہے۔

ریچل کارسن امریکی سائنسدان، مصنف اور ماہرِ ماحول ہیں۔ انھوں نے حیاتیات میں تعلیم حاصل کی۔ جب وہ میساچوسیٹس میں میرین بائیوالوجیکل لیبارٹریوں میں کام کر رہی تھیں۔ اس وقت انھوں نے اپنی پہلی کتاب انڈر دی سی ونڈ لکھی جو کہ سمندری حیاتیات پر تھی۔ ان کی یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۴۰ء میں فش اینڈ وائلڈ لائف سروس کی چیف ایڈیٹر رہیں۔ ان کی دوسری کتاب 'دی سی آراونڈ اَس' نے نیشنل بک ایوارڈ جیتا۔ سمندری زندگی اور سمندری حیاتیات سے متعلق ان کی تیسری کتاب 'دی ایڈج آف سی' ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ماحولیات پر کیمیائی اور کیڑے مار ادویات اثرات سے رونما ہونے والے اثرات پر اپنی پوری توجہ مذکور کر دی۔ اسی دوران انھوں نے 'سائلنٹ سپنرنگ' لکھی۔ یہ کتاب انسان کے ان محرکات سے متعلق ہے جو ماحول میں بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانیت اور فطرت دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی کہ کیڑے مار ادویات اور صنعتی سرگرمیاں ماحول کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس سے انسان کی صحت اور ماحولیات دونوں پر مضر اثرات رونما ہو رہے ہیں۔

جین گڈال ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ چیمپنزی پر تحقیق اور مطالعہ کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا طویل حصہ ان کے ساتھ گزارا اور ان پر تحقیق کی۔ انہیں بچپن سے ہی جانوروں سے لگاؤ تھا اور افریقہ کے سفر کے خواب کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ابتدائی عمر سے ہی رقم اکٹھی کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ جانوروں کی زندگی پر تحقیق کے

ادارے 'لوئس لیکی' کی سیکرٹری کے طور پر ایک لمبے عرصے تک جانوروں کی طرزِ زندگی کا مطالعہ کرتی رہیں۔ دقیق مطالعہ اور تحقیق کے بعد ان کی کتاب 'ان دی شیڈ واف مین' منظرِ عام پر آئی۔ انھوں نے بطور محقق چیمپنزی کے ماحول دوست ہونے پر سیر حاصل تحقیق کی اور جانوروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کا خیال تھا کہ جانور بھی انسان کی طرح زمین پر بسنے کا حق رکھتے ہیں۔ انھوں نے جنگلی حیاتیات کے تحفظ کے لیے 'جین گڈال انسٹی ٹیوٹ برائے وائلڈ لائف ریسرچ' کی بنیاد رکھی۔ ان کو جانوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

عورت اور قدرت کا تعلق ابد سے ہے عورت زمین کی مانند تخلیق کار ہے وہ موسمیاتی تبدیلیوں سے جلد اثر انداز ہوتی ہے اس لیے وہ ماحول کے بدلتے تیور کو جلد محسوس کر لیتی ہے اور اس کے تدارک کے لئے کوشش بھی کرتی ہے۔ دراصل عورت ماحول کے لئے ممتا جیسے جذبات رکھتی ہے۔ کچھ ایسا ہی بیگم اختر ریاض الدین کے ساتھ بھی ہے ان میں ماحولیاتی مادریت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کے اس رخ کا احساس سات سمندر پار کے آغاز میں ہی ہو جاتا ہے۔ جب وہ چیری کے شگوفوں کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ بہار میں چیری کے گلابی شگوفے جاپان خاص طور پر ٹوکیو کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جاپان میں چیری بلاسم فیسٹیول ایک قومی تہوار کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ جاپانی لوگ چیری کے درختوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے باقاعدہ طور پر چھٹیاں لیتے ہیں۔ یہ پھول بہت کم وقت کے لئے کھلتے ہیں۔ بظاہر جاپانی فطرت پسند ثابت ہوتے ہیں یہ فطرت کو انسان کے برابر کا مقام ہی دیتے ہیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو فطرت اور انسان دونوں تسلط پسند نہیں کرتے دونوں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے لئے لازمی ملزم ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کی دوڑ میں اول آنے کی چاہ نے ان سے فطرت پسندی کسی حد تک چھین لی ہے۔ بیگم اختر بھی اسی محصور کن خیال کے ساتھ جاپان آتی ہیں وہ اپریل کو بہار کا پیامبر کہتی ہیں اس کا اظہار وہ یوں کرتی ہیں:

> ''جاپان دیکھیے تو اپریل میں سن سن کر عمر گزر گئی تھی اور اب جاپان، بہار اور میں ایک ہی وقت میں دوچار ہوئے تھے۔ اپریل کا مہینہ بہاروں کا پیامبر ہوتا ہے اس ماہ شب و روز پھولوں کی خوشبو میں رچے ہوتے ہیں یہی شوقِ بہاراں مجھے جاپان لایا تھا۔''(۱۳)

بیگم اختر ریاض الدین حسن پرست واقع ہوئی ہیں اور خوبصورت قدرتی مناظر ان کی کمزوری ہیں۔ جیسے ہی ان کی آنکھیں کوئی خوبصورت منظر دیکھتی ہیں ان کا قلم اور ذہن قلانچیں بھرنے لگتا ہے۔ وہ عام اور روزمرہ نظر آنے والے مناظر کو ایسے خوبصورت الفاظ میں بیان کرتی ہیں کہ منظر فلم کی صورت ڈھال لیتا ہے۔ ان کا جمالیاتی شعور ان کی سیاحتی روداد کے دوران جابجا بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین پھولوں کے نام ان کے موسم کے بارے میں گہری تحقیق رکھتی ہیں قاری کو قدم قدم پر ان کی اس خصوصیات کا احساس ہوتا ہے۔

> ''اپریل کے مہینے میں میگنولیا اور کمیلیا کے کٹورے خوب کھلے ہوئے تھے۔ آتشی گلابی ازیلیا کے گچھے کے گچھے لہروں کی طرح امنڈ امنڈ کر ایسے بدمست ہو کر پھیلے ہوئے تھے کہ ایک سبز پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔''(۱۴)

بیگم اختر ریاض الدین کو روس میں پھولوں اور پھولوں کی کمیابی کا احساس شدت سے بار ہا ستاتا ہے۔ جب ان

کے دل میں لینن اور اسٹالن کے مقبرے پر جاتے ہوئے رسم دنیا نبھانے کی خاطر پھول خریدنے کا خیال آتا ہے تو اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

''میرے ساتھیوں نے محض از راہ اخلاق ان شورہ پشت رفتگان کے لئے کچھ پھول خریدنا چاہئے پھول وہاں دستیاب نہیں تھے آخر کچھ نیم پژمردہ گل داودی تیس روبل (پندرہ روپے) میں مل گئے۔''(۱۵)

بیگم اختر ریاض الدین کی ماحول دوست طبیعت اس کم یابی کے پیچھے توجیہات کی متلاشی نظر آتی ہیں اور وہ جلد ہی اس کے پسِ پردہ وجہ تلاش کر لیتی ہیں:

''ماسکو میں پارکوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ درخت زیادہ نہیں ہیں۔گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں ماسکو پر ہوائی حملوں کے بعد حکومت نے اس خیال خام سے بیشمار درخت کٹوا دیے تھے کہ وہ زہریلی گیس اپنے اندر جذب کر لیں گے۔جو لوگوں کی صحت کے لئے بہت مضر ہوگی۔''(۱۶)

اور دوسری وجہ موسم کے سرد ہونے کو قرار دیتی ہیں۔بظاہر روس کے لوگ موسم سرما میں گھر کے اندر پھول اگانے کی کوشش کرتے ہیں اور موسم گرما میں بھی وہ اس کے لئے کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔اس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

''البتہ موسم گرما میں روسی لوگ پودے اور جھاڑیاں اگانا بے حد پسند کرتے ہیں۔غریب ترین کوارٹروں میں بھی پودے باغیانہ انداز سے اپنے دھانی اور گہرے کاہی عملے کے ساتھ سرکشی پر تیار کھڑے نظر آتے تھے۔''(۱۷)

انسان صدیوں سے پھولوں کو مختلف طریقوں اور مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔پھول انسانی نفسیات پر مثبت اثرات ڈالتے ہیں اور انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔بیگم اختر ریاض الدین اپنے سفرناموں میں انسانوں کا پھولوں کے ساتھ لگاؤ کو خوش مذاقی کے انداز میں بیان کرتی ہیں:

''میری میزبان نے ایک خاص دعوت کے موقع پر فن لینڈ سے ہوائی جہاز کے ذریعے گلابی کارنیشن منگوائے۔جو باوا کے مول پڑے خیر دعوت کامیاب رہی۔ان پھولوں کو بہت سراہا گیا۔معزز خواتین نے انہیں دیکھ دیکھ کر آہیں بھریں۔ایک دو غش کھاتے کھاتے بچیں۔دعوت کا دن گزر گیا مگر کئی روز بعد تک ان پھولوں کی حفاظت کی جاتی رہی ان کو طرح طرح کے بتاشے اور کشتے کھلائے گئے۔لیکن ان کی شادابی پر معین وقت آنا تھا۔بعض پھول سرنگوں ہونے لگے۔ہر روز کوئی نہ کوئی پھول کملا کے گردن ڈال دیتا تو ساتھ ہی میری سہیلی کا دل بیٹھ جاتا۔''(۱۸)

بیگم اختر ریاض الدین قدرت کے شاہکار دیکھنے کے لیے بحری جہاز کا سفر کرتی ہیں وہ سمندر کی زندگی اور سمندری اتار چڑھاؤ کو محسوس کرنا چاہتی ہیں اور دوران سفر اپنے احساس اور جذبات کو پرکھتی ہیں۔سمندری سفر کا احساس ان کے لئے بالکل نیا تھا اس انوکھے احساس اور جذبات کو وہ کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

''صبح کے دھندلکے میں جہاز نے لنگر اٹھا لیا اور خراماں خراماں وطن کے ساحلوں سے دور اجنبی

پانیوں میں ایک نقطہ سا بن کر گم ہوگیا۔ زندگی نے وسیع تر زاویہ تیار کر لیے۔ مجھے بھی اپنی روح کو کھینچ تان کر خودداری کے تقاضے سے ان کی پیائش پر پورا اتر نا تھا۔ شڑپ شڑپ، چھپ چھپ پانی کا سینہ چر چر کٹتا جا رہا تھا۔ نئی زندگی، نئے پانی، نئے افق، نئے آفتاب، ایک نئی بھوک، ایک مزید تشنگی، سحر نوخیز کی الھڑ کنواری لہریں سورج کا دھلا دھلا، بھولا بھولا چہرہ، جس کو دیکھ کر لہریں حیا سے اور ڈوب جاتیں۔ ڈبکی کھاتیں، پھر ابھرتیں، پھر بکھرتیں، جہاں تک نظر جاتی ایک رواں انقلاب، ایک بے تاب سراسیمہ ہلچل، آسمان تک ہلنے لگا، دولنے لگا۔ ایک لہر لپکی میں نے ہاتھ بڑھایا، تھامنے کیلئے لیکن وہ آدھے راستے میں دم توڑ گئی۔ میں تھی اور لہریں۔ دماغ میں دل میں روح میں، ساری جان میں پانی سائیں سائیں کرتا نکل رہا تھا۔ میری ننھی سے خودی غوطے کھانے لگی۔ کہاں یہ بے انداز پانی کہاں میں کہ ایک دم خودی نے جھرجھری لی اور ابھر کر ابھی وسعتوں پر چھا گئی۔''**(۱۹)**

سمندر کی دنیا انسانی دنیا سے بہت الگ ہوتی ہے اس کے الگ جذبات اور احساسات ہوتے ہیں۔ ان وسعتوں کی گہرائی کو وہ ہی ناپ سکتا ہے جو قدرت کے راز کھوجنے میں جتا رہتا ہے۔ اس بابت بیگم اختر ریاض الدین اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

''قدرت کے تین عنصر یہ عمل کر کامل ہوئے۔ آب، آسمان اور میری لازوال روح، میری روح نے سمندروں کو گہرائی دی۔ نیلی آسمانی بھاپوں کو ملائم نرمی دیں۔ لہروں کو شوخ حرکت، بیکراں سفید جھاگوں کو پاکی، مدوجزر کو لچک، ساری کائنات کو ذوق زیست، ہر ایک ننھے سے بھڑکتے آتش فشاں کی مانند اڈتی، پھٹتی اور میرے خوابوں کی طرح روشنیوں میں تحلیل ہو جاتی، زمانہ رفتہ کی تمام شاعری و جنوں میرے آنے کی پیشن گوئی، میرے بعد آنے والے تمام عشق و نغمہ، میری گونج، میری جھنجناہٹ، میری روح سمندر کی روح پر غالب تھی۔''**(۲۰)**

دنیا بلا شبہ علوم کا خزانہ ہے۔ انسان ہمیشہ اس خزانے کی کھوج میں لگا رہتا ہے کہ وہ کسی طرح وہ ان علوم تک رسائی حاصل کر سکے اور انسان انہی علوم کی وسعت کو کھوجنے میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ سمندر کے راز اور سمندر کی گہرائی انسان کے لئے ایک ایسی پہیلی ہے جس کو بوجھنے میں انسان صدیوں سے محوسفر ہے۔ انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ سمندری دنیا کو دریافت کر سکے اور اس میں چھپے خزانوں سے استفادہ حاصل کر سکے لیکن سمندری دنیا یا سمندری رستے زمین سے، بہت مختلف اور پیچیدہ ہیں۔ اسی لیے ہزار جتن کے باوجود انسان سمندر کے رازوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین بھی قدرت کے چھپے رازوں کے آگے سر تسلیم خم کرتی نظر آتی ہیں:

''ایک پانی کی دنیا پیچھے، ایک پانی کی دنیا آگے، آسمان اور سمندر یکساں۔ افق کی باریک تقسیم بے معنی واللہ علم۔ سمندر اوپر چل رہا تھا کہ آسمان نیچے بہہ رہا تھا۔ یا اس ہمہ گیر ابستان میں ہمارا کشادہ محل ایک سفید جھینگے کی طرح اللہ حوالے پھسلتا چلا جا رہا تھا۔''**(۲۱)**

امریکہ کو جاننے کے لیے امریکی عوام کو جاننا بے حد ضروری ہے یہاں کے لوگوں کی زندگی پر مشین راج کرتی ہے اسے موسم کی سرد اور گرم سے فرق نہیں پڑتا اس کا موسم وہی ہے جو اس نے خود اپنے گھر میں تخلیق کیا ہوا ہے اسے چاند کی ٹھنڈی دھوپ کی تپش سے کوئی واقفیت نہیں ہے وہ ہر کام بجلی میں کرنے کا عادی ہے۔امریکی ایک ربورٹ کی مانند ہے جو بنا جذبات اور احساسات کے کام کرتے ہیں اور ربورٹ کا زندگی کی خوبصورتی اور فطرت کے شاہکار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔نیو یارک کی بلند و بالا عمارتیں بیگم اختر ریاض الدین کو ماچس کی ڈبیا کی طرح لگتی ہیں۔ان عمارتوں میں اتنی گھٹن ہے کہ یہاں بہار کی عنایاں اور فضا کے پتوں کی چرچراہٹ بھی پر نہیں مار سکتی۔وہ ان بلند و بالا عمارتوں سے آسمان کو اٹھانے والی تکلیف کی آواز بن جاتی ہیں اور اس کے درد کو محسوس کرتی ہیں:

> ''یہ ماچس کے ڈبوں کے فلک بوس طومار جن میں انسانیت دم بخت ہے۔ان جدید پنجروں کے کاروباریوں نے اپنی کھڑکیوں سے کبھی بہار کے شگوفوں کو چٹکتے نہ سنا نہ کبھی خزاں میں در بدر پتوں کی ویرانہ وحشتیں دیکھیں۔یہ بے حس بلندیاں یہ طویل سرد مہریاں۔یہ شیطانی لاف زنیاں، جنہوں نے انسان کو چیونٹی سے زیادہ حقیر بنا دیا۔ان کے نوکدار شہتیر آسمان کے گداز گوشت میں چبھ رہے ہوں گے۔اوپر سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے زمین تنگ ہوگئی ہے ان پر نیچے سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے آسمان تنگ ہو گیا۔''(۲۲)

درخت اور سبزہ زار زمین کی آرائش کے ساتھ ساتھ زمین پر زندگی کی علامت بھی ہوتے ہیں۔بیگم اختر ریاض الدین اس راز سے واقف ہیں کہ سبزہ زار آنکھوں کو بھلا لگنے کے ساتھ ساتھ صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہیں:

> ''نیو یارک سے لندن آ کر معلوم ہوتا ہے۔پاؤں زمین پر لگ گئے۔چیونٹی سے ہم انسان بن گئے۔لندن کی عمارات چونا مٹی۔بوسیدہ موسم زردہ۔سال خوردہ لیکن انسانی گرفت میں۔گردن اٹھا کر دیکھ سکتی ہے۔نظر مڑ کر جلد واپس آ سکتی ہے۔اس کے باغوں کے سبزہ زاروں میں انسان کچھ لمحوں کے لیے کارخانوں کے دود و دخان کو بھول کر اس کے انگوری ریشموں پر لوٹ لگاتا ہے۔دل بے ساختہ چاہتا ہے کہ چوپایا بن کے گھٹنوں کے بل اس کی تازہ کچی کچی ہریاول کو چننے لگے۔''(۲۳)

بیگم اختر ریاض الدین میں موجود ماحول دوست قدرتی نظاروں کی دلدادہ خاتون دوران سیاحت خشکی اور تری ہر حال میں امنڈ کر باہر آ جاتی ہے۔ہوائی میں دورانِ سیاحت وہ ہونولولو میں رہائش اختیار کرتی ہیں۔جو بحرالکاہل کا ایک جزیرہ ہے۔بحرالکاہل کرہ ارض کا سب سے بڑا سمندر ہے۔یہ امریکہ اور آسٹریا کے بیچ واقع ہے۔اس میں تقریباً ۵۲۰۰ جزیرے موجود ہیں۔ہوائی بحرالکاہل کا ہی ایک جزیرہ ہے۔بیگم اختر ریاض الدین ہوائی میں دورانِ سیاحت بحرالکاہل کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوتی ہیں۔کائنات میں بکھرا فطرت کا ہر رنگ انھیں متاثر کرتا ہے۔بیگم اختر ریاض الدین قدرت کے شاہکار کو بیان کرنے کے لیے اسی پائے کے شگفتہ الفاظ اور اچھوتی تشبیہات کا استعمال کرتی ہیں:

> "شام کو ہم جزیرے کا اولین معائنہ کرنے کار میں گئے ڈھلتے سورج میں بحرالکاہل کروٹیں بدل رہا تھا اور چاروں طرف زمرد کی آمریت مستحکم ہو چکی تھی۔تا حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ۔یوں احساس ہوا کہ

جزیرے'اوداہو'میں کہنہ مشق کائنات نئے سرے سے شباب برائی ہے۔اس کے ننھے منے رقبے
میں فطرت کا رنگ ہرانگ پایا جاتا ہے۔سمندر یہاں عمیق تر ہوتا چلا گیا ہے۔یہ جنوبی یورپ کے
آبی کناروں سے زیادہ نیلا اور چمکدار ہے۔دوپہر کے وقت اس نیلم کی بھڑک آنکھیں خیرہ کردیتی
ہے۔میں نے وجدانی حسن میں اس طرح ڈوبے ہوئے ساحل بہت کم دیکھے ہیں۔ان کی ٹھنڈی
عنبریں ریتیں گیلے بدن پر یوں پھسلتی تھیں جیسے ٹیلکم پاؤڈر۔''(۲۴)

بیگم اختر ریاض الدین قدرت کے شاہکار پر سرتسلیم خم کرتے ہوئے مناظر کو اس دلفریب انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قاری کو ہر منظر اپنی آنکھوں کے سامنے رقص کرتا محسوس ہوتا ہے۔ان کا شگفتہ اسلوب قاری کو اس طرح اپنے سحر میں لیتا ہے کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب سفر نامہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا:

''یہاں کے کوہساروں نے اس جزیرے کے گول چہرے کو ایک نیا زاویہ بخشا ہے۔یہ کہیں
سنگلاخ ہیں اور کہیں اتنے سبز کے ازلی برساتوں کا رین بسیرا معلوم ہوتے ہیں۔ان کی کنواری
گھاس پر انسان اپنا سایہ ڈالتے جھجکتا ہے۔''(۲۵)

بیگم اختر ریاض الدین کو ہوائی کے پھول اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں وہ ان کا ذکر اس انداز اور دلچسپی سے کرتی ہیں کہ ہر طرف ان پھولوں کی خوشبو بکھری ہوئی ہے حتیٰ کہ پودوں کو چھو کر آتی محسور کن ہوا کا احساس پھلوں کے رس کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے ان کا ماحولیاتی نسائی شعور ان کے سفر ناموں میں قدم قدم پر آشکار ہوتا ہے۔پھول اور پودے ان کی کمزوری ہیں، وہ لکھتی ہیں:

''اس مغرب و مشرق کے مرکز کا ایک جاپانی باغ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے یہ اتنا ایمان شکن ہے کہ
میں اکثر لائبریری جاتے جاتے اس میں گھس جاتی تھی۔جزائر'تھیٹی' کے پھول خصوصا' گارڈینیا'،
'زرد چمبیلی'۔کنول۔کچا کچا سبزہ۔نڈھال پانی اور رنگین مچھلیاں اور اس کی پشت پر ممنوع درختوں
کا ذخیرہ۔''(۲۶)

بیگم اختر ریاض الدین کا ذوق جمال کسی بھی خطے میں دوران سیاحت ماند نہیں پڑتا وہاں پرورش پانے والے پھولوں کے نام ان کی اقسام اور تعداد کے متعلق تحقیق ضرور کرتی ہے اور اپنے ماحول دوست طبیعت کے باعث قاری کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتی ہیں:

''ہوائی اس کو بڑا جزیرہ کہتے ہیں۔لیکن میں اس کو گلستانوں کا قلب کہوں گی۔تمام امریکہ اور باقی
دنیا کو پھول اسی جزیرے سے برآمد ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اس کی نرسریوں میں گل و شجر کی ۲۲
ہزار اقسام ہیں۔جہاں تک نظر جاتی ہے پھولوں کی کیاریاں ہی کیاریاں ہیں۔''(۲۷)

بیگم اختر ریاض الدین پھولوں اور پودوں کی اہمیت سے واقف ہیں کہ یہ ماحول کے لیے فلٹر کا کام کرتے ہیں یہ ہوا سے نقصان دہ اجزا کو جذب کر لیتے ہیں۔ان کے نزدیک پودے بھی زندہ جاوید ہوتے ہیں سانس لیتے ہیں اور قدرت کے بنائے قوانین کے تحت اپنا کام کرتے ہیں ان کا توڑنا جہاں ماحولیات کے لیے نقصان دہ ہیں وہیں قدرت

کے اصولوں کی بھی نفی ہے:

''جہاں کے پھول پتے توڑنے کا دل نہیں چاہتا کہ خودرو کائنات کا کوئی متبرک اصول نہ ٹوٹ جائے۔''(۲۸)

پھول پودے کرہ ارض کا حسن ہیں۔ یہ زمین کے قدرتی حسن کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اگر زمین پر پھول پودے نہ ہوتے تو ہماری دنیا اجاڑ بیابان خطے کی مانند ہوتی۔ جب پھول اور پودے نہ ہوتے تو پرندوں کی چہچہاہٹ بھی نہ ہوتی اور گلشن میں شبنم بھی نہ ہوتی۔ پھول اور پودے نہ صرف کرہ ارض کو آراستہ کرتے ہیں بلکہ انسانی ضروریات کو پورا بھی کرتے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین اپنے سفرنامہ 'دھنک پر قدم' میں پودوں اور پھولوں سے اپنے جذباتی لگاؤ کا اظہار کرتی ہیں اور ان کے ذکر کے بنا اپنی تحریر کو ادھورا قرار دیتی ہیں:

''ہوائی کا قصہ نامکمل رہ جائے گا۔ جب تک اس کے پھل اور پھول کا ذکر نہ کیا جائے۔ ہوائی میں ہر وہ پھول اگتا ہے یا اگ سکتا ہے جو ہمارے یہاں اگتا ہے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک کے بیشتر پھول بھی وہاں اگائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وادیاں نیم گرم اور پہاڑیاں نیم سرد۔ اس لئے سارے سال دنیا جہان کے پھول لے لیجیے۔ لمبی تفصیل بے معنی ہے۔ مجھے تو جن سے خصوصی عشق ہے وہ یہ ہے تھے۔ اپنی طرف کی چنبیلی اور موتیا دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کو ہوائی میں 'پکاکی' کہتے ہیں۔''(۲۹)

پھولوں اور پودوں سے متعلق بیگم اختر ریاض الدین کے مطالعے کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ پھول چاہے ٹوکیو کے ہوں، ہوائی کے یا ہانگ کانگ کے ہوں۔ وہ پودوں سے متعلق قاری کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہیں۔ کون سے پھول وہاں کے علاقائی ہیں اور کون سے دیگر ممالک سے لائے گئے ہیں۔ پھولوں اور پودوں سے متعلق ان کی مکمل اور جامع معلومات قاری کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔

''لیکن ہوائی کے مخصوص پھول کچھ اور تھے۔ سب سے سوشل پھول 'پلومیریا' ہے جسے ہمارے یہاں 'فران جاپانی' کہتے ہیں۔ اس کے گجرے ہر تقریب پر پہنے جاتے تھے۔ گجرے میں نے دہلی لکھنؤ کے بھی دیکھے اور بمبئی کے بھی۔ لیکن ہوائی کے گجروں کا مقابلہ نہیں۔ یہ کمبخت امیر قوم کے پھول ایئر کنڈیشنر کمروں میں رہتے ہیں اور تازگی یہ کہ جب گزرے خریدو تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ڈالیوں پر سے ٹوٹ کر آئے ہیں۔ کوبرا سانپ کی طرح ۴، ۵ انچ موٹے اور گز بھر لمبے۔ اس جسامت کے ہار کبھی نہیں دیکھے۔ یہ سب پھولوں کی افراط کی بات ہے جو جزائر ساری دنیا کو پھول برآمد کریں ان کے گجرے اس ناپ کے ہی ہونگے۔ کمبخت کارنیشن کے ہمارے یہاں دو چار گملے مشکل سے سال بھر کی محنت کے بعد پھولتے ہیں۔ وہاں اسی پھول کے موٹے موٹے ڈسنے والے گجرے ناگن کی طرح لہلہاتے تھے۔ صرف مجھے ان کی لونگ جیسی تیز بو پسند نہیں۔ ایک پھول پیپل کے پتے کی شکل بالکل عنابی ساٹن کا بنا ہوا ہے۔ چھو کر بھی دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے

مصنوعی ہے۔اس سرخ پتے پر زرد رنگ کا مکوڑہ بیٹھا ہوا ہے۔جو اس کے نقش و نگار کا حصہ ہے (یہ سچ مچ کا مکوڑا نہیں ہے) اسے اینٹ تھوریم کہتے ہیں۔اور یہ پھول ہفتوں نہیں مرجھاتا لیکن خاصا مہنگا ہے۔پانچ روپے کے صرف دو ملتے ہیں۔اس جزیرے کی اصلی جان فردوسی پرندہ ہے جو جگہ جگہ اگ رہا ہے۔یہ پھول سچ مچ بہشتی پرندے کی طرح ہوا میں معلق ہے کہ اگر گویا ابھی پرواز کا ارادہ رکھتا ہے۔اس کے پر نیلے پیٹ نارنجی اور چونچ ہری دور دور اس کے جھنڈ اس طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے فاختاؤں کا غول۔اس کے علاوہ جاپان کا "ازیلیا" بھی ہے اور جنوبی ایشیا کا ہر شگوفہ نظر آتا ہے۔"(۳۰)

حسن کو دیکھنے والی آنکھ خوبصورت ہوتی ہے کچھ ایسا ہی بیگم اختر ریاض الدین کے ساتھ ہے۔وہ قدرت کے شاہکار تب بھی تلاش لیتی تھیں جب لوگ وہاں یکسانیت کا راگ الاپتے تھے۔

"ہمارے سوات کی طرح اس خطے کو دیکھنے کے لیے کہتے ہیں کہ اکتوبر یا اپریل کا موسم بہترین ہوتا ہے۔اس لئے یہاں گرمیوں میں نہیں آنا چاہیے کیوں کے یکساں موسم منظر میں بھی یکسانیت پیدا کر دیتا ہے۔صاحب یہاں ہمیں تو اس کی یکسانیت میں بھی تنوع نظر آیا۔ایک ایک وادی میں پانچ پانچ رنگ۔کہیں پتے جامنی کہیں زاعفرانی کہیں کھیت زیتونی یا دھانی۔درخت تانبے کی طرح تپ کر بھڑک رہے تھے۔"(۳۱)

بیگم اختر ریاض الدین جا بجا قدرتی شاہکار دیکھ کر دھنگ رہ جاتی ہیں:

"ایک طرف انگلستان کے بلند ترین پہاڑ جن پر دور دور برف کی سفید شہادتیں نظر آتی ہیں اور اشجار سے ڈھکے ہوئے۔چھوٹی بڑی سوچ سے اوپر جھیلیں۔جن کے شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر میک اپ درست کرنے کو جی چاہے۔ہزار ہا اقسام کے خودرو پودے پھول بوٹے۔جگہ جگہ نوکیلی گھاٹیاں، کشیدہ وادیاں جہاں انسان کم اور گلاب زیادہ۔وحشی جانور تو شکاریوں اور شاہی خاندان کی نذر ہوگئے۔اب ہرن، خرگوش، لومڑیاں، سرخ گلہریاں، پرند مرغابیاں وغیرہ ہیں۔کئی ایسے مقام آئے تھے کہ کار روک کر سانس روکنا پڑتا تھا۔حسن اپنی پوری رعنائی میں نیم عریاں لپٹا ہوا تھا۔نظر کی وسعت ہی آپ کو دغا دے تو آپ کی کم نصیبی ورنہ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں دیکھئے۔سنگتراش کی چھینی اور کس چتر کار کا قلم ہوگا جو قدرت کے تین زاویے کو اس طرح پیش کر سکے؟"(۳۲)

اللہ کی وحدانیت کی گواہی فطرت قدم قدم پر دیتی ہے لیکن ان اشاروں کو سمجھنے کے لیے عقل کی گواہی ضروری ہے۔قرآن کریم میں اللہ کی واحدانیت کا عقیدہ عقل و منطق کے ذریعے ثابت کیا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ کائنات کو بنانے والا اور اس کا نظام چلانے والا ایک ہی ہوسکتا ہے ورنہ کائنات کا نظام کبھی نہیں چل سکتا۔بیگم اختر ریاض الدین کے نزدیک قدرتی شاہکار بطور خود وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔لیکن اس کے لیے دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل چاہیے۔لیکن مذہبی قید نے انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیا ہے:

''یہاں ننھے ننھے کلیسا بھی نظر آئے۔ یہ پادری بھی ہر مشکل جگہ مذہبی سرنگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں۔اور سادہ لوح دیہاتیوں، پہاڑیوں کو تواری وعظ دیتے ہیں۔میری رائے میں تو یہاں رہنے والوں کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو جگہ یزدان کل کو عیاں عکس ہو جس کے ہر رخ سے خداداد حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔وہاں اندھیرے گرجے میں لا کر لوگوں کو کیا بتانا کہ خدا بھی ہے؟''(۳۳)

میکسیکو کے موسم کا احوال بتاتے ہوتے ان کا اندازِ بیان عاشقانہ ہو جاتا ہے۔میکسیکو کا موسم انھیں بے حد متاثر کرتا ہے۔وہاں کا موسم ان کے احساس حسن اور ذوقِ جمال کو خیرہ کرتا ہے۔ان کا جمالیاتی اظہار اسے 'ابدی بہار' کا نام دینے پر مجبور کر دیتا ہے:

''میکسیکو شہر خط استوا کے شمالی قرب میں ہے۔اس لیے اتنی بلندی کے باوجود اس کو وہ موسم ملا ہے۔جس کو "ابدی بہار" کہتے ہیں۔سدا ہری گھاس ہرے بھرے درخت جو جھاڑو میں بھی اپنے پتے نہیں جھاڑتے۔اس کی فضا میں عجیب قسم کی دھمک اور کرارہ پن ہے۔ یہاں ہر روز ایک ناقابل یقین کرشمہ دیکھنے میں آتا ہے۔ جسے پہلے پہلے تو میں نے نہیں مانا۔پھر کئی دن دیکھنے کے بعد اس پر ایمان لے آئی۔وہ یہ کہ میں سے اکتوبر تک یہاں ہر روز چار بجے کے قریب پھوار پڑتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلی فون پر چار سے پوچھ کر عین مقررہ وقت پر آتی ہے اور چھ بجے تک غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ بارش کی دیوی بھی ہم مجبور انسانوں کی طرح وقت کی مقید ہو سکتی ہے۔''(۳۴)

پھول ماحول کو راحت بخشتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دیکھنے والے کی آنکھ کو ٹھنڈک کا احساس دلاتے ہیں اور اگر بات کسی ماحول دوست انسان کی ہو تو وہ پھول پودوں کے بنا کسی جگہ کا تصور نہیں کر سکتا کجا باغ۔بیگم اختر ریاض الدین بھی میکسیکو کے ایک باغ کا حال زار بتاتی ہیں۔

''تیسرے پہر ہم "بوردا گارڈن" گئے۔ یہ چاندی کے کروڑ پتی سوداگر نے بنایا تھا اور یہاں ملکہ " کارلوتا" بیشتر وقت گزارتی تھیں۔ایک عجیب حسرت اس کے درودیوار پر برس رہی تھی۔ وہی کیفیت جو نور جہاں کے مقبرے پر جا کر ہوتی ہے۔"نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے" حالانکہ سوائے پھولوں کے سب ہی کچھ تھا آٹھ تالاب،فوارے،تاریخ کے خاموش شاہد دیرینہ درخت۔سنگتراشیدا جھروکے،ستون،ڈھلتے سورج کی برقانی دھوپ امرودوں کے درخت پر پڑ رہی تھی غریب ملکہ کارلوتا۔''(۳۵)

جانور ماحول کا ایک لازم و ملزم رخ ہیں۔ ماحول ان سے اور یہ ماحول سے ہیں۔بل فائٹنگ ایک ظالمانہ کھیل ہیں جانوروں کے حقوق سے متعلق کئی تنظیمیں اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔لیکن قدامت پسند طبقہ اسے ثقافتی ورثہ گردانتا ہے۔بظاہر یہ ایک ظالمانہ کھیل ہے بیگم اختر ریاض الدین اس کھیل سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

''میکسیکو کا کوئی ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔جب تک آپ اس کی بل فائٹ نہ دیکھیں۔میرا بالکل ارادہ نہیں

تھا۔اس کے متعلق نہ لکھوں کیوں کہ زیادہ تر قارئین نے یہ تماشا کم سے کم فلموں میں تو ضرور ہی دیکھ رکھا ہے۔پھر مجھے خود ڈر تھا کہ شاید خونریز وحشی کھیل میری نازک انتڑیاں برداشت نہ کر سکیں۔"**(۳۶)**

مختلف اقوام ماحولیات کے تحفظ کے لیے اقدام کرتی نظر آتی ہیں جلد یا بدیر انھیں کسی حد تک اس کے بچاؤ کا احساس ہو گیا۔درختوں پودوں اور فطری مناظر کا خیال رکھنا چند اقوام تمدنی اور معاشرتی اقدار کا حصہ ہیں جیسے مصر میں درخت کاٹنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔مصر میں کئی ہزار سال پرانے درخت آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں اس کا اندازہ ادھر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان درختوں کا ذکر انجیل میں موجود ہے۔لندن میں کم از کم تین ہزار پارک اور سرسبز مقامات ہیں جن کی حفاظت کے لیے اہتمام کیا جاتا ہے اگر کوئی درخت کسی وجہ سے جل جائے اس درخت کی یاد میں ادھر پتھر نصب کیا جاتا ہے۔اسلام میں درخت لگانا صدقہ جاریہ ہے اس سے نا صرف ماحول کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ درختوں سے خدا کی بنائی ہر طرح کہ مخلوق استفادہ حاصل کرتی ہے۔بیگم اختر ریاض الدین بھی قوموں کے ماحولیاتی تفکر کا تقابل کرتے ہوئے امریکہ اور کینیڈا کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اس رات ہم ٹھہر کر نیاگرا آبشار پہنچے۔اس آبشار کے دو رخ ہیں۔جب امریکن رخ سے دیکھیں تو دھوبی گھاٹ معلوم ہوتا ہے۔لیکن کینیڈا کی طرف سے آبی حسن کا سامراجی رعب اور اس پر پھولوں اور صفائی نے مزید نکھار پیدا کر دیا ہے۔"**(۳۷)**

بیگم اختر ریاض الدین کی ماحول دوست طبیعت ماحولیاتی تفکرات اور اقدامات کا تجزیہ کرتی ہے۔وہ امریکن اور برطانوی فطرت بچاؤ شعور کی نشاندہی کرتی ہیں:

"جب امریکن رخ سے دیکھیں تو دھوبی گھاٹ معلوم ہوتا ہے لیکن کینیڈا کی طرف سے آبی حسن کا سامراجی رعب اور اس پر پھولوں اور صفائی نے مزید نکھار پیدا کر دیا ہے۔"**(۳۸)**

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، (نئی دہلی: کتابی دنیا،۲۰۰۴ء)، ص۳۲

2. Oxford advance learning's dictionary

3. Webstes'd new world encyclopedia

۴۔ القران الکریم، سورۃ نارعات: آیت۲۹-۳۰ (لاہور، ضیا القران پبلی کیشنز)

5. Rekhta.org.com مورخہ۱۹/مارچ۲۰۲۰ء رات ۱۰:۱۸

6. King, Ynestra, 'The Ecofeminist Perspective', in:Caledecott, L&S. Leland (eds), Reclaiming the Earth:Women speak out for Life on Earth. The Women's Press, London, 1983

7. Merchant, Carolyn. Radical Ecology:The Search for a Liveable World, New York:Routledge 1992

8. Griffin, Susan. Women and Nature:The Roaring Inside Her, New York: Harper and Row, 1978.

9. Reuther Radford R. New Woman /New Earth, Seabury Press, New York,1975. 1988.

10. Merchant, Carolyn. Radical Ecology:The Search for a Liveable World, New York:Routledge 1992

11. Shiva, Vandana. Staying Alive:Women, Ecology and Development. London:Zed Books, 1988

۱۲۔ نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی افسانہ، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص۲۷۶

۱۳۔ بیگم اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء)، ص۱۶

۱۴۔ ایضاً، ص۱۷ ۱۵۔ ایضاً، ص۶۰ ۱۶۔ ایضاً، ص۶۶

۱۷،۱۸۔ ایضاً، ص۳۷ ۱۹۔ ایضاً، ص۲۷ ۲۰،۲۱۔ ایضاً، ص۱۴۵

۲۲۔ ایضاً، ص۱۴۸ ۲۳۔ ایضاً، ص۱۷۳

۲۴۔ بیگم اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، (لاہور: کواپرا بک شاپ اینڈ آرٹ گیلری، ۲۰۰۲ء)، ص۱۶۵

۲۵۔ ایضاً، ص۱۴ ۲۶۔ ایضاً، ص۱۵ ۲۷۔ ایضاً، ص۱۹

۲۸۔ ایضاً، ص۲۹ ۲۹۔ ایضاً، ص۳۵ ۳۰۔ ایضاً، ص۴۲

۳۱۔ ایضاً، ص۴۳ ۳۲۔ ایضاً، ص۶۸ ۳۳،۳۴۔ ایضاً، ص۶۸

۳۵۔ ایضاً، ص۸۴ ۳۶۔ ایضاً، ص۱۰۱ ۳۷۔ ایضاً، ص۱۳۵

۳۸۔ ایضاً، ص۱۳۵